عربوں کی مقفل سوچ

ملٹن ویورسٹ *

تلخیص: حیران خٹک

یہ ۱۹۹۳ء کے آخری دنوں کی بات ہے، میں ایک شام یروشلم کے دمشقی دروازے سے ہوتا ہوا پرانے شہر میں داخل ہوا۔ چند ہفتے پہلے ہی اوسلو معاہدہ ہوا تھا اور انتفادہ کی کئی سالوں کی ہنگامہ آرائی کے بعد آخرکار دکانوں کی رونق ایک دفعہ پھر لوٹ آئی تھی۔ جب میں نے ان دکانوں میں سجائی ہوئی اشیا پر نظر ڈالی تو ایک ایسی بات محسوس کی جو اس سے پہلے مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

عربوں کی اکثر دوکانوں پر زیتون کی لکڑی کے بنے ہوئے اونٹ دعوت نظارہ دے رہے تھے جبکہ یہودیوں کی دکانوں پر نئے ڈیزائنوں کے زیورات خریداروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ بظاہر یہ دو مختلف چیزیں یہودیوں اور عربوں کے ذوق کی ترجمانی کر رہی تھیں لیکن بادی النظر میں مغرب اور مشرق وسطیٰ میں پائے جانے والے ثقافتی بُعد کی غماز تھیں۔ لکڑی سے بنے ہوئے اونٹ بدوی تہذیب کے مظہر تھے جس کے ساتھ صدیوں سے عرب وابستہ چلے آرہے ہیں۔ عربوں کی دوکانوں پر ان اونٹوں کی موجودگی اس بات کی تنبیہ تھی کہ جو کوئی عرب کلچر کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میری نظروں کو لکڑی کے بنے ہوئے اونٹوں کے مقابلے میں چاندی کے بنے ہوئے وہ گلوبند زیادہ بھائے جو کہ یہودی آبادکاروں کی اس ترقی پسند سوچ کا مظہر تھے جو وہ مغرب سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یروشلم کے بازار میں عربوں کی دکانوں میں موجود لکڑی کے بنے ہوئے اونٹ اس بات کی نشاندہی کررہے تھے کہ عرب دنیا آگے کی بجائے پیچھے جارہی ہے۔ کیونکہ جدید دنیا مسابقت کی دنیا ہے لیکن

*Milton Viorst, "The Shakles on the Arab Mind, *The Washington Quarterly*, Spring 1998, pp.168 - 175

عربوں میں مسابقت کی سکت نہیں ہے۔ اس میدان میں غربت نہیں ثقافتی انفرادیت ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔

۱۹۹۴ء کے متحدہ عرب امارات کی اقتصادی رپورٹ کے مطابق عربوں کی فی کس آمدنی ۲۰۰۰ ہزار ڈالر ہے جو کہ اسرائیل کے مقابلے میں سات گنا اور امریکہ کے مقابلے میں دس گنا ہے۔ لیکن یہ ۲۰۰۰ ڈالر فی کس کی آمدنی بھی بگاڑ کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ اس میں تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی شامل ہے جو کہ کچھ ممالک میں چند ہاتھوں میں مرتکز رہتی ہے۔ اگر تیل کی آمدنی کو منہا کر دیا جائے، کیونکہ یہ پیداوار کسی اچھی انتظامی صلاحیتوں کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ زمین کے ارضیاتی خزانے ہیں، تو فی کس آمدنی بہت کم رہ جاتی ہے۔ موجودہ کم آمدنی سے زیادہ بدشگونی کی علامت یہ حقیقت ہے کہ یہ آمدنی ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں ۲۰ فیصد رہ گئی ہے۔ یہ وہ عرصہ ہے جس کے دوران پوری مغربی دنیا اور اکثر ترقی یافتہ ممالک کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔

> جدید دنیا مسابقت کی دنیا ہے لیکن عربوں میں مسابقت کی سکت نہیں ہے۔ اس میدان میں غربت نہیں ثقافتی انفرادیت ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عرب ممالک میں مجموعی قومی پیداوار ۱۹۸۰ء کے بعد صرف ایک فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھی ہے جبکہ اس عرصہ کے دوران آبادی تین گنا یعنی ۱۶۵ ملین سے ۲۴۵ ملین ہوگئی ہے۔ اس عرصہ کے دوران برآمدات، سرمایہ کاری، پیداواری صلاحیت اور انسانی و قدرتی وسائل کو بروئے کار لانے کی صلاحیت نہایت سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہوئی ہے۔ جبکہ قریبی سالوں میں تیل کی مسلسل گرتی ہوئی قیمتیں مستقبل میں مزید خراب اقتصادی صورت حال کی نشاندہی کرتی ہے۔

اگرچہ سعودی عرب اور ہمسایہ خلیجی ریاستوں میں تیل کے ذخائر اعلیٰ معیار زندگی کو یقینی بناتے ہیں لیکن دوسرے عرب ممالک پر اقتصادی جمود اور بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے مجموعی اقتصادی دباؤ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ دباؤ فوری طور پر غذائی مواد کی فراہمی کے سلسلے میں شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا

ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس سے صحت اور تعلیم کے محکمے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ زوال نہایت سرعت کے ساتھ عربوں کی اجتماعی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔

تاہم عربوں کے عظمت وجلال کو صرف مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جاسکتا۔ان سخت جان لوگوں نے سیکڑوں سال پہلے اپنی فوجی قوت سے دنیا کو حیران وششدر کر دیا تھا۔عربوں نے دنیا پر علمی اور تکنیکی برتری بھی حاصل کر لی تھی۔غرض مغربی تہذیب کسی طور بھی عربوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔لیکن وہی برتر وبالا عرب انہی شعبوں میں پیچھے رہ گئے ہیں جن میں کبھی مغرب کے امام ہوا کرتے تھے۔اس سے زیادہ افسوس ناک یہ امر ہے کہ عربوں کو اپنی اس پستی کا احساس تک نہیں ہے اور وہ ابھی تک ماضی کے حسین خوابوں میں مگن ہیں۔

وہی برتر وبالا عرب انہی شعبوں میں پیچھے رہ گئے ہیں جن میں کبھی مغرب کے امام ہوا کرتے تھے۔اس سے زیادہ افسوس ناک یہ امر ہے کہ عربوں کو اپنی اس پستی کا احساس تک نہیں ہے اور وہ ابھی تک ماضی کے حسین خوابوں میں مگن ہیں۔

چند عشرے کی بات ہے کہ بحرالکاہل کا علاقہ بھی مشرق وسطیٰ کی طرح غریب تھا۔میرے ایک مصری دوست کو اپنے دادا کی بتائی ہوئی یہ بات اب بھی یاد ہے کہ ۱۹۰۵ء میں قاہرہ کے تمام باسیوں نے جاپان کی فوجی فتح کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔آج نہ صرف جاپانی بلکہ کوریائی، چینی یہاں تک کہ فلپائنی بھی خوشحالی کے لحاظ سے مغرب کے ہم پلہ ہو گئے ہیں لیکن عرب ہنوز پستی میں مبتلا ہیں۔ جو توانائی، جرات، انتظامی جذبہ اچانک بحرالکاہل کے معاشروں میں نمودار ہوا وہ مشرق وسطیٰ میں ابھی تک مفقود ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب جدوجہد سے زیادہ قسمت پر یقین رکھتے ہیں۔عرب معاشرے کو بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ اپنے آپ کو چلانے میں جو دقت پیش آ رہی ہے اس کی وجہ سے وہ مستقل طور پر دباؤ کے شکار ہیں مغرب کے رہنماؤں کے مطابق اس دباؤ کے نتیجے میں دہشت گردی شروع ہو سکتی ہے۔اس کے علاوہ سستے ہتھیاروں کی مدد سے عمومی تباہی کے لیے بھی طبل جنگ بج سکتا ہے۔بھوک اور بے روزگاری کی وجہ سے نقل مکانی پہلے ہی شروع ہو چکی ہے اور بہت سی عرب برادریاں یورپ اور امریکہ میں پناہ لے رہی ہیں۔عرب معاشرے کا یہ بوجھ مغرب پر مسلسل بڑھ رہا

ہے جس کا فوری طور پر تدارک ممکن نہیں۔

عربوں کو معاشی لحاظ سے اس پستی تک پہنچانے کی ذمہ داری ان علمی اور فکری مباحث پر عائد ہوتی ہے جن میں عرب دسویں صدی کے وسط میں بغداد میں گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت اسلام کی عمر صرف تین صدیاں تھی اور اسلام غیر لچکدار روایات میں رہ رہا تھا۔ اپنی فتوحات کے دوران عباسی خلفاء نے مفکرین کے ایک ایسے گروہ کی خدمات حاصل کیں جو یونانی افکار سے متاثر تھے۔ یہ مفکرین اسلام کے نظام فکر میں منطق اور جدت کو شامل کرنے کے حامی تھے، لیکن قدامت پسند مذہبی رہنماؤں نے اس طرز فکر کی شدید مزاحمت کی اور آخر کار ان کو شکست دی اور یوں نشاۃ ثانیہ کا راستہ روک دیا گیا جو بعد میں یورپ کی طرف کھل گیا۔ ان فاتحین نے اس کے بعد شرعی قوانین کو مدون کرنے کا آغاز کیا۔ یہ دستاویزات ساتویں صدی کی ان صحرائی روایات پر مبنی تھیں جو ابتدا ہی سے عرب تہذیب کی علمبردار تھیں۔

> آج نہ صرف جاپانی بلکہ کوریائی، چینی یہاں تک کہ فلپائنی بھی خوشحالی کے لحاظ سے مغرب کے ہم پلہ ہو گئے ہیں لیکن عرب ہنوز پستی میں مبتلا ہیں۔ جو توانائی، جرات، انتظامی جذبہ اچانک بحرالکاہل کے معاشروں میں نمودار ہوا وہ مشرق وسطیٰ میں ابھی تک مفقود ہے۔

مشرق وسطیٰ میں کئی سال کی جادہ پیمائی کے بعد مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ وہاں روزمرہ کی زندگی پر اسلام کے اثرات اس سے کہیں زیادہ گہرے اور نمایاں ہیں جو یورپ میں عیسائیت کے ہیں۔ عرب دنیا آج بھی ازمنہ وسطیٰ کے اس یورپ کا نظارہ پیش کر رہی ہے جب یورپ پر عقیدے کی حکمرانی تھی۔

بیرونی فاتحین نے کئی مرتبہ عرب دنیا کو اجاڑا اور عرب کلچر قدیم یونانیوں سے لے کر جدید یورپ تک تمام خارجی اثرات کے لیے کھلا رہا لیکن عرب دنیا نے بہر حال اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھا اور خارجی تہذیبوں کے ساتھ بہت کم مصالحت کی۔

اسلامی ثقافت کے اس مثبت پہلو کے ساتھ ساتھ اس کا منفی پہلو یہ بھی ہے کہ بہت سے عربوں کو

اس بات کا قلق رہا کہ انہوں نے اپنی تہذیب سے باہر کی دنیا سے بہت کم اکتساب کیا۔ عرب کے مغرب سے متاثر دانشور اس بات سے شاکی ہیں کہ اسلام کے محصور معاشرے کی وجہ سے مسلمان ان ترغیبات سے محروم رہے جو ان میں عالمی سطح پر دوسری اقوام کے مقابلے کی سکت پیدا کر سکتی تھیں۔

ڈاکٹر عبدالفتح الشیخ مسلمان دانشوروں کی برادری کی ایک اہم شخصیت اور الازہر یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں ملاقات کی۔ الشیخ نے مجھے بتایا۔

الازہر یونیورسٹی کا بنیادی مقصد طلبہ کو صحیح اسلام پڑھانا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قرآن کے ہر قاری کو اس کا فہم بھی حاصل ہو یہ صلاحیت تو برسوں کے مطالعے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ مختلف سائنسی نظریات کی طرح اسلام میں بھی مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اور ان میں مختلف مسائل کے سلسلے میں اختلاف موجود ہے۔ مثلاً وضو کیسے کیا جائے۔ کیا دونوں ہاتھوں اور چہرے کا دھونا ضروری ہے۔ ہم طلبہ کے سامنے یہ تمام آراء پیش کرتے ہیں لیکن ان کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ صحیح روش کون سی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحیح کیا ہے۔ خلفاء راشدین پیغمبرؐ کے جانشین بنے۔ یہ وہ لوگ تھے جو رسولؐ سے براہ راست ہدایت حاصل کر چکے تھے اور ان کے گرد پیغمبرؐ کے ایسے ہی پیروکاروں کا گروہ موجود تھا۔ وہ قرآن کی تفسیر اور تعبیر احسن طریقے سے کرنے کے اہل تھے۔ ان کا یہ تجربہ کئی نسلوں تک کارآمد رہا۔ اب کسی کو بھی وہ بصیرت نصیب نہیں ہوگی جو براہ راست پیغمبرؐ کی ہم نشینی کی وجہ سے ان لوگوں کو نصیب ہوئی تھی۔ اب مسلمانوں میں ایسے ماڈرن لوگ پیدا ہوئے ہیں جو اپنے طریقے سے قرآن کی تعبیر کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نیت صحیح ہو لیکن جب وہ قرآن کی نئی تعبیر متعارف کراتے ہیں تو وہ نہایت کھوکھلی ہوتی ہے۔ نئے خیالات کبھی بھی پرانے کے برابر نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں ہر تعبیر فطری طور پر اسلام کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔ یہاں الازہر میں ہم اپنے سکالرز کو صحیح نظریات اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

بہت سے سکالرز سال ہا سال کے مطالعے کے بعد بھی اولین تعبیروں سے رجوع کرتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن مزید تعبیروں کے لیے بند ہو چکا۔ لیکن جن کوائف کا حامل شخص روایتی تعبیروں کو چیلنج کر سکتا ہے اس کا وجود آج مفقود ہے۔ رسول کریمؐ کے صحابہ نہایت محتاط تھے۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ اگر انہوں نے خدا کی مرضی کی غلط تعبیر کی تو انہیں آخرت میں اس کا حساب دینا ہوگا۔

بعض اوقات ایک آدمی یہاں تک کہ ایک سکالر بھی غلطی کر لیتا ہے لیکن بعد میں اس سے یہ رجوع کر لیتا ہے لیکن اگر آپ مکمل علم نہ رکھنے کے باوجود قرآن کی تعبیر کریں گے تو لوگ اس سے گمراہ ہوں گے۔ اور آپ جتنا بھی مطالعہ کریں لیکن جب آپ اپنی غلط تعبیر پر مصر رہیں گے تو آپ بے دین کہلائیں گے۔

اس سلسلے میں قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر نصر حامد ابوزید کا کیس ڈرامائی نوعیت کا حامل ہے۔ وہ ۱۹۹۲ء میں قرآن کی تعبیر کی نئی تکنیک کی وجہ سے مشکل میں پھنس گئے۔ انہوں نے اپنی کئی کتابوں میں جدید علوم اور اصطلاحات کی روشنی میں اسلام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ علمی حلقوں میں ان کتب کی کافی پذیرائی ہوئی اور ابوزید کو یورپ اور امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچرز کے لیے بلایا گیا۔

ابوزید جب قاہرہ یورسٹی میں پروفیسر شپ کے عہدے کے لیے ایک اسلامی سکالر شیخ عبدالصبور شاہین کی قیادت میں قائم اکیڈمک کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو شاہین نے نہ صرف اسے متذکرہ عہدے کے لیے اہل نہیں سمجھا بلکہ اس کے کام کو غیر اسلامی قرار دیا۔ اس کے بعد ابوزید کی زندگی عذاب میں پھنس گئی۔ اسے قتل کی دھمکیاں دی گئیں اور اس کے نکاح کو فاسد قرار دینے کے لیے مصری عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ عین انہی دنوں شیخ الازہر نے فتویٰ دیا کہ اگر ابوزید اپنے الحاد سے توبہ نہیں کرتے تو انہیں اسلامی شریعت کے مطابق سزائے موت دے دینی چاہیے۔

جب میں نے قاہرہ یونیورسٹی میں ان کے متنازعہ نظریات کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے کہا:

الازہر کے لوگ اسلام کے بنیادی ماخذ قرآن، جو کہ اللہ کا کلام ہے، اور اپنی رجعت پسندانہ تعبیر میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ وہ دونوں کو یکساں مقدس خیال کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانی کلام کو بھی اتنا ہی پاکیزہ اور مقدس سمجھتے ہیں جتنا کہ اللہ کا کلام ہے۔ بنیاد پرستی اب اپنے ہی نظریات کے دفاع اور دوسروں کے تنقیدی جائزوں کو مسترد کرنے کا نام بن گئی ہے۔ میں نے جدید علمی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے متن کا از سر نو جائزہ لیا ہے تاکہ اس کو زیادہ قابل فہم بنایا جا سکے۔

ابوزید کو مغرب کے علمی پیمانوں پر قرآنی متن کو جانچنے پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ انہوں نے مغربی

تہذیب کا دفاع کرتے ہوئے اسلامی قدامت پرستی پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔

جب میں نے ابوزید کو شیخ الازہر کے ساتھ اپنی گفتگو کے متعلق بتایا تو انہوں نے شیخ کو ان افراد میں سے ایک قرار دیا جو بارہ سو سال پہلے کہی ہوئی باتوں کو مستند سمجھتے ہیں۔ ابوزید نے کہا کہ لوگ صرف قرآنی متن پر نگاہ رکھتے ہیں اور اس میں نہ تو مغرب سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اپنے طور پر کوئی تخلیقی ذہن استعمال کرتے ہیں۔ نہ ہی عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی موجودہ جمود سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نے ایسی سوچ کو تباہ کن قرار دیا۔

> یونانی افکار سے متاثر مفکرین اسلام کے نظام فکر میں منطق اور جدت کو شامل کرنے کے حامی تھے، لیکن قدامت پسند مذہبی رہنماؤں نے اس طرز فکر کی شدید مزاحمت کی اور آخر کار ان کو شکست دی اور یوں نشاۃ ثانیہ کا راستہ روک دیا گیا جو بعد میں یورپ کی طرف کھل گیا۔

جب میں نے ابوزید کے سب سے بڑے حریف اور قاہرہ کی ایک بڑی مسجد کے امام شیخ عبدالصبور شاہین سے بات چیت کی تو انہوں نے کہا کہ میں نے اس [ابوزید] کے تحقیقی کام کا جائزہ لیا ہے۔ وہ متعصب اور استشراقی حوالوں پر مبنی ہے۔ وہ ایک شیعہ کے نقطۂ نظر سے قرآن کو دیکھتا ہے اور اندلسی دور کے صوفیانہ مباحث سے متاثر دکھائی دیتا ہے، جو حقائق سے کوسوں دور ہیں۔ شاہین نے ابوزید کو مارکسسٹ قرار دیتے ہوئے کہا کہ جو شخص بھی اپنے آپ کو قرآن کا ناقد کہتا ہے وہ کافر اور مرتد ہے۔ اس شخص نے قرآن کے متعلق جو کچھ کہا وہ خالصتاً الحاد پر مبنی ہے۔

ابوزید کے متعلق قاہرہ کی عدالت میں تنسیخ نکاح کا جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ آخر اس کا فیصلہ ابوزید کے خلاف ہی ہوا اور اگست ۱۹۹۶ء میں اس جوڑے کا نکاح فاسد قرار دیا گیا۔ جج نے اپنے فیصلے میں مدعا علیہ کو توہین رسالتؐ کا مرتکب قرار دیا۔ اس کی رائے میں ابوزید اسلامی عقائد کے بعض پہلوؤں کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار تھا۔ لیکن یہ روش غلط ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام ہے اور اس کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص اس کے بعض حصوں کو تسلیم کرے اور بعض سے انکار کرے۔ کوئی مسلمان نماز، زکوۃ یا حج پر جانے کا منکر نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی دیدہ دانستہ کسی رکن سے

انکار کرے تو وہ مرتد ہے۔

عدالت کے فیصلے کے مطابق ابوزید مرتد ہے۔ کیونکہ وہ ایمان کے بعد الحاد کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کا قرآن کی نئی تعبیر کا دعویٰ باطل ہے۔ کیونکہ کوئی بھی تعبیر مسلمان کو شریعت سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ علماء نے قرآن کی تفسیر کی حدود و قیود مقرر کی ہیں۔ یہ اللہ سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ اللہ کا حق ہے کہ کسی ایک کے مرتد ہونے کی صورت میں جوڑے کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔

اس فیصلے سے ابوزید اور مصر کے سیکولر حلقوں کو شدید دھچکا لگا۔ خود مصر کے اسلام پسند حلقوں نے بھی اس فیصلے کو حیرت و استعجاب کے عالم میں سنا۔ یہ ازمنہ وسطیٰ کے مذہبی عدل کی طرف مہلک مراجعت تھی اور اس کو تبدیل کرنا خود حکومت کے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ اس فیصلے نے ابوزید اور اس کی بیوی پر یہ بات واضح کی کہ وہ اب کبھی اپنے وطن نہیں لوٹ سکیں گے۔ چنانچہ یہ دونوں اس وقت سے یورپ میں افسردگی کے عالم میں جلاوطنی کے دن گزار رہے ہیں۔

> مصر کے صف اوّل کے متجدد محمد سالم آلاوہ نے اسلام کے روایتی تصور کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا کہ وہ اس رائے کو مسترد کرتا ہے کہ اسلام نے مقدس متون پر نظر ثانی کو ممنوع قرار دیا ہے یا دوسرے الفاظ میں لوگوں کے ذہنوں پر پہرے بٹھا دیئے ہیں۔

مصری لوگ اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے مصر کو ایک جدید اور خوشحال ملک کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن وہ اپنی اسلامی اقدار کی قربانی دے کر ہی یہ مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ عربوں نے بیسویں صدی میں کئی نظاموں کو آزمایا لیکن کوئی بھی نظام ان کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکا۔ اس لیے ان میں ایک دفعہ پھر بنیاد پرستی کے لیے تڑپ پیدا ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دورِ جدید کے ثمرات سے بھی محروم ہونا نہیں چاہتے۔

ایک صدی پہلے محمد عبدہ اور دوسرے مسلمان مفکرین نے تو یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ عرب بیک وقت جدید مغربی تہذیب اور اسلامی اقدار کو ساتھ لے کر چل سکتے ہیں۔ یہ نظریہ تو موجود رہا لیکن لادینیت کے

سرگرم حامیوں اور بنیاد پرستوں کی موجودگی میں پنپ نہ سکا۔ لادینیت پرستوں کے مطابق اسلام انتہائی حد تک غیر لچکدار ہے۔ جبکہ روایتی مسلمانوں کا موقف تھا کہ متجددین اسلام کے لبادے میں چھپے ہوئے مارکسسٹ ہیں اور یہ کہ اسلام میں جدیدیت کی پیوند کاری نہیں ہوسکتی۔

''الاہرام'' کے ایک کالم نگار فہمی ھویدی جدید و قدیم کو ساتھ لے کر چلنے کے علمبردار ہیں۔ وہ اسلامی ریاست کے نظریے سے متفق ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ ایسی ریاست انتخابات کے ذریعے ہی وجود میں آسکتی ہے۔ سیکولر اس بات پر ان کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ بنیاد پرستی کے سلسلے میں معذرت خواہانہ رویہ رکھتے ہیں جبکہ روایتی مسلمانوں کو بظاہر وہ مرتد نظر آتے ہیں۔ ھویدی کی رائے ہے:

> ہم جانتے ہیں کہ ہم واپس لوٹ نہیں سکتے۔ ان خیالی لوگوں کا کہنا ہے شریعت میں کسی طور بھی ترمیم نہیں ہو سکتی لیکن ہم اس خطرے کو مسترد کرتے ہیں اگرچہ انسان کا تعلق خدا کے ساتھ تبدیل نہیں ہوسکتا لیکن لوگوں کا آپس میں تعلق مکان و زمان کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اسلام کو عصرِ حاضر میں یہی چیلنج درپیش ہے۔

اسی طرح مصر کے صف اوّل کے متجدد محمد سالم آلاوہ نے اسلام کے روایتی تصور کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا کہ وہ اس رائے کو مسترد کرتا ہے کہ اسلام نے مقدس متون پر نظرثانی کو ممنوع قرار دیا ہے یا دوسرے الفاظ میں لوگوں کے ذہنوں پر پہرے بٹھادیئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے برعکس اسلام فکری اور علمی اظہار رائے کی آزادی کی نہ صرف بنیادی انسانی حقوق کے طور پر ضمانت دیتا ہے بلکہ مسلمانوں کو فکری آزادی کو نافذ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر ہم مسلم تہذیب کی حیثیت سے دنیا میں اپنے تشخص کو بحال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تعبیر نو کے جاری عمل سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسلام میں مغربی طرز کی فکری آزادی کا حامی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں اسلام کی لگائی ہوئی قدغنوں کی حمایت کرتا ہے۔ اگرچہ وہ مرتد کو قتل کرنے کے موقف کو مسترد کرتا ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو شخص اسلامی شعائر کا احترام نہیں کرتا اسے نظر بند کردینا چاہیے اور بعض حالات میں اس کو سزا بھی دینی چاہئے۔ چنانچہ الآوہ جیسا آزاد خیال مفکر بھی مسلمانوں کے ذہنوں پر بٹھائے گئے تمام پہروں کو ہٹانے کا حامی نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جب تک مسلمان فکری آزادی کے متعلق اپنا رویہ

تبدیل نہیں کریں گے وہ موجودہ چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے انہیں مغرب اور بحرالکاہل کے طرح آزاد خیال، خوشحال اور مضبوط معاشرہ قائم کرنا ہوگا۔ ہر معاشرے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کے تحفظ کو ترجیحی بنیادوں پر ممکن بنائے۔ لیکن اس بات کے امکانات کم ہیں کہ عرب مقابلے کے اس دور میں اپنی تہذیب وثقافت کو خیر باد کہے بغیر یہ مقام حاصل کر لیں گے۔

[ملٹن ویورسٹ عرصہ پچیس سال سے مشرقِ وسطیٰ پر لکھ رہے ہیں۔ ان کا یہ مضمون ان کی تازہ کتاب "پیغمبرؐ کے سائے میں: اسلام کی روح کے لیے جدوجہد" سے لیا گیا ہے۔]